غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں
اور
غیر مسلموں کے روابط

چوتھا سید خلیل اللہ حسینیؒ توسیعی لکچر، جس میں مسلمان اقلیت اور غیر مسلم اکثریت کے درمیان مذہبی، سماجی، سیاسی اور معاشی تعلقات جیسے اہم عالمی مسئلہ پر قرآن وحدیث، سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور فقہ اسلامی کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے اور مسلمانوں کے لئے راہ عمل بتائی گئی ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

کل ہند مجلس تعمیر ملت، حیدرآباد

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِیْ الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔ (الممتحنة:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انھوں نے تم کو تمہارے گھر سے نکالا ہے، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے ، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلاة والسلام علی سید المرسلین ، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین، ومن تبعھم بإحسان إلی یوم الدین۔

جناب صدر، بزرگان محترم!

یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ''کل ہند مجلس تعمیر ملت'' نے معروف قائد نیز جان پُرسوز، دل دردمند اور فکر ارجمند کی مالک شخصیت اور تنظیم کے بانی جناب سید خلیل اللہ حسینیؒ سے منسوب سالانہ توسیعی خطبہ کے لئے ''غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے روابط'' جیسے اہم موضوع کا انتخاب کیا ہے، یہ جہاں اپنے بزرگوں کو یاد رکھنے کا ایک بہتر طریقہ ہے، وہیں تنظیم کی بصیرت، شعور وآگہی اور زمانہ شناسی کی دلیل بھی ہے، نیز قائد محترم سے اس موضوع کی مناسبت بھی ظاہر ہے؛ کیوں کہ آصف جاہی حکومت کے سقوط کے بعد جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب مرحوم نے پوری جرأت اور بالغ نظری کے ساتھ مسلمانوں کی رہنمائی کی اور انھیں بتایا کہ وہ غیر مسلم اکثریت والے اقتدار کے زیر سایہ اپنے ملی تشخص کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کریں اور کس طریقہ پر رواداری اور بھائی چارہ کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کو تحلیل ہونے سے بھی بچائیں؟ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ 'مجلس تعمیر ملت' نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے ہونے پر شرعی نقطۂ نظر سے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی، تہذیبی اور مذہبی مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک اہم سیمینار منعقد کیا تھا، جو اس موضوع پر ملک میں غالباً پہلا سیمینار تھا، اس کے بعد متعدد تنظیموں اور اداروں نے اس موضوع پر مذاکرہ کی مجلسیں منعقد کیں، جس کو اسی سیمینار کی صدائے بازگشت کہا

جا سکتا ہے، اس طرح آج کا توسیعی خطبہ تنظیم کی ان فکری کوششوں کا تسلسل ہے۔

حضرات ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت اس دنیا میں تشریف لائے ، اس وقت اکثر علاقوں میں مملکت کا مذہب متعین ہوتا تھا، دوسرے مذاہب کے لوگوں کو یا تو وہاں رہنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی یا کم سے کم انھیں اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی اجازت نہیں دی جاتی تھی ، ایرانی حکومت کا مذہب آتش پرستی تھا، ان کے مذہبی تعصب کا حال یہ تھا کہ وہ رومیوں کے جن علاقوں پر قابض ہوتے تھے ، وہاں عیسائیوں کے مذہبی مقامات کی ایک ایک اینٹ اُکھاڑ پھینکتے تھے، روم میں وہ عیسائیت نافذ تھی ، جو درحقیقت سینٹ پال کی ایجاد تھی ، یہاں بُت پرستوں کو تو رہنے کا موقع ہی نہیں تھا، یہودیوں کے لئے بھی عرصۂ حیات تنگ تھا؛ بلکہ عیسائیوں کے وہ فرقے جنھیں مرتد قرار دے دیا گیا تھا اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے کو تیار نہیں تھے ، وہ بھی رومی سلطنت میں اس کی وسعت کے باوجود کوئی جائے پناہ نہیں پاتے تھے اور ایسے علاقوں کی پناہ حاصل کئے ہوئے تھے، جہاں باضابطہ کوئی حکومت نہیں تھی ، جیسے حجاز وغیرہ کا علاقہ۔

جب مکہ سے دین حق کا سورج طلوع ہوا تو اسی مزاج کے تحت کفر کی تاریکیوں کے لئے یہ ایک ناقابل قبول واقعہ تھا؛ چنانچہ مسلمانوں پر ایسے مظالم توڑے گئے اور ناانصافیاں روا رکھی گئیں ، جو نہ صرف انسانیت کے خلاف تھیں ؛ بلکہ عربوں کی مسلّمہ قبائلی روایات کے بھی خلاف تھیں ؛ اسی لئے بالآخر مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے ، چنانچہ ایک طویل عرصہ تک عام معمول یہی رہا کہ جب کسی خطہ پر غیر مسلموں کا اقتدار مستحکم ہو جاتا تو مسلمان وہاں سے عالم اسلام کی طرف رخت سفر باندھتے ؛ تاکہ وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل کر سکیں ، ہاں کہیں کہیں ایسا ضرور ہوا کہ مقامی حکمراں کے منصفانہ مزاج کو دیکھتے ہوئے اور ان کی طرف سے ملنے والی مذہبی آزادی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کا کوئی گروہ وہاں قیام پذیر

ہو گیا؛لیکن بڑے پیمانہ پر ایسے واقعہ کاظہور غالباً سقوط اندلس کے بعد ہوا، جہاں مسلمانوں کے آخری فرمانروا نے اس معاہدہ کے ساتھ اقتدار کی کلید عیسائی فرمانروا کے حوالہ کی کہ جو مسلمان یہاں رہنا چاہیں، انھیں اپنے مذہب پر عمل کی پوری آزادی حاصل ہوگی، ان کی عبادت گاہیں قائم رہیں گی اور انھیں وہ تمام حقوق دیئے جائیں گے، جنھیں آج ’’انسانی حقوق‘‘ کہا جاتا ہے؛ چنانچہ قرطبہ، غرناطہ اور بلنسیہ وغیرہ میں مسلم آبادی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے موجود تھے؛ جیسا کہ علامہ ابن ہمامؒ (م:۸۶۱) اور دوسرے فقہاء کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے،افسوس کہ عیسائی حکمرانوں نے اس معاہدہ کا ذرا بھی پاس ولحاظ نہیں رکھا اور کچھ ہی عرصہ بعد ایسے روح فرسا مظالم ڈھائے کہ شاید ہی انسانی تاریخ میں انسانیت سوزی اور ظلم وجور کی ایسی مثال مل سکے،مسلمانوں کا نہ صرف قتل عام کیا گیا؛ بلکہ انھیں سمندر کی بے رحم موجوں کے حوالہ بھی کر دیا گیا اور بالآخر تھوڑے ہی عرصہ میں اسپین فرزندان توحید سے خالی ہو گیا اور مسلمان یا تو یہاں سے ہجرت کر گئے یا انھوں نے راہ حق میں دارورسن کو گلے لگایا۔

حضرات ! یورپ میں کلیسا اور حکومت کی طویل جنگ اور کلیسا کی شکست پر اس جنگ کے اختتام نے ایک نئے تصور کو جنم دیا کہ سلطنت کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو جس پر ملک میں رہنے والے تمام شہری عمل کرنے کے پابند ہوں ؛ بلکہ مذہب کو ایک نجی مسئلہ کا درجہ حاصل ہو اور ہر شہری کو نجی زندگی میں اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہو، اس تصور نے جہاں لادینیت کو فروغ دیا اور انسانیت کو اس سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا، وہیں اس کا ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ مغرب میں مذہبی جور وتشدد ختم ہوا اور پوری دنیا میں بڑے پیمانہ پر مذہبی اقلیتیں وجود میں آئیں ؛ اسی لئے آج دنیا میں مذہبی ،تہذیبی اور لسانی اقلیتوں کے اعداد وشمار جمع کئے جائیں تو شاید وہ اکثریتی فرقے سے بھی بڑھ جائیں، یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں اقلیتوں کے حقوق کو خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی ہے، جو بین الاقوامی معاہدات

کا ایک حصہ ہے، اور یہ ضروری بھی ہے؛ کیوں کہ اگر اکثریت ظلم و جور پر اُتر جائے اور فرقہ پرستی کا مظاہرہ کرنے لگے تو بعض اوقات ''اکثریتی آمریت''، شخصی آمریت سے بھی بڑھ جاتی ہے۔

خود مسلمان بھی بہ حیثیت اقلیت آج مشرق سے مغرب تک دنیا کے ہر علاقہ میں موجود ہیں اور کہا جاتا ہے کہ پوری دنیا کی مسلم آبادی کا قریب قریب پچاس فیصد حصہ غیر مسلم ممالک میں آباد ہے، بیسویں صدی میں بہ حیثیت اقلیت مسلمانوں کی کثرت کے بہت سے اسباب ہیں، جن میں چند خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

اول : یہ کہ مغرب کی استعماری طاقتوں نے جب عالم اسلام پر قبضہ کیا تو وہ مزدور اور کارکن کی حیثیت سے بڑی تعداد میں زیر قبضہ ممالک سے مسلمانوں کو اپنے یہاں لے گئے، جیسے فرانس میں بڑی تعداد میں موجود جزائری مسلمان یا جنوبی افریقہ میں مَلے نسل کے لوگ۔

دوسرے : مغربی ملکوں نے ایک پالیسی یہ بھی اختیار کی کہ مسلمان ملکوں میں اپنے پسندیدہ اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے وہاں کی مسلمان آبادی کو مغربی ملکوں میں منتقل ہونے کی ترغیب دی جائے؛ چنانچہ فلسطین اور بوسنیا وغیرہ سے بڑی تعداد میں مسلمانوں کو مغربی ملکوں میں پناہ دی گئی۔

تیسرے : مسلمان حکومتوں میں جمہوریت اور انسانی حقوق سے محرومی اور سیاسی مخالفین کے ساتھ مظالم کے باعث بھی بہت سے مسلمان یورپ اور امریکہ کی طرف منتقل ہوئے، ان تارکین وطن کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہوئی اور مغربی ملکوں کو یہ فائدہ ہوا کہ انھیں اپنے یہاں ان حکومتوں کے ایک اپوزیشن گروپ کو رکھنے اور ان کی پرورش کرنے کا موقع ملا؛ تاکہ بوقت ضرورت ان ملکوں کی حکومت کو غیر مستحکم کیا جاسکے اور وہاں اپنی پسند کے حکمراں رکھے جاسکیں، عراق، افغانستان اور مغربی کنارہ (فلسطین) کے حکمراں اس کی واضح مثال ہیں۔

چوتھے: مغرب کی صنعتی ترقی کی وجہ سے وہاں کارکنوں کی ضرورت بڑھی اور مغرب میں شرح پیدائش کی کمی نے اس ضرورت میں مزید اضافہ کردیا، دوسری طرف چوں کہ مغرب نے عالم اسلام پر جدید ٹکنالوجی کا راستہ بند کر رکھا ہے، یہ ممالک صنعتی ترقی کے اعتبار سے عام طور پر بہت پیچھے ہیں، اور یہاں کے ہنرمندوں اور مزدوروں کو مقامی طور پر حسبِ ضرورت کسبِ معاش کے مواقع فراہم نہیں ہیں؛ اس لئے ایک بڑی تعداد ایشیائی ملکوں سے مغرب کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔

زیادہ تر یہی اسباب ہیں، جن کی وجہ سے غیر مسلم ممالک میں مسلمان اقلیتوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، اس کے علاوہ ادھر چند دہوں سے عالم اسلام سے بہت سے مسلمان دعوتی نقطۂ نظر سے بھی مغرب منتقل ہوئے ہیں اور وہاں اسلام قبول کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے، خاص کر نائن الیون کے بعد سے؛ لیکن افسوس کہ دعوتی نقطۂ نظر سے ہجرت کرنے والے تارکین وطن اور ان کی کوششوں سے اسلام قبول کرنے والے نومسلموں کی تعداد ابھی بھی بہت تھوڑی ہے؛ البتہ ہندوستان کی نوعیت شاید پوری دنیا سے مختلف ہے، جہاں مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی اور وہاں تارکین وطن کے بجائے مقامی اور پشتینی مسلمان آباد ہیں، پھر بھی وہ اقلیت میں ہیں، اسلامی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی مثال ملے کہ مسلمان کسی خطہ میں اتنے طویل عرصہ تک برسر اقتدار رہنے کے باوجود اقلیت میں رہے ہوں، یقیناً دعوت دین سے بے توجہی نے انھیں اس صورتِ حال سے دوچار کیا ہے۔

حضرات! عام طور سے کثیر مذہبی معاشرہ کا بانی مغرب کو سمجھا جاتا ہے؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کی بنیاد اسلام نے رکھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے پہلے چاہتے تھے کہ اہل مکہ اگر اسلام قبول نہ بھی کریں تو کم سے کم مسلمانوں کو اسلام پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی اجازت دے دیں؛ چنانچہ اہل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صلح کے دو

فارمولے پیش کئے ، ایک یہ کہ ہم دِنوں کی تقسیم کرلیں ، کچھ دن ہمارے دیویوں اور دیوتاؤں کی عبادت ہوا کرے، جس میں آپ بھی شریک ہوں، اور کچھ دن آپ کے خدا کی عبادت ہواوراس میں ہم بھی شرکت کریں، دوسرا فارمولہ یہ تھا کہ دنوں کی تقسیم نہ ہو؛ بلکہ روزانہ آپ کے خدا کی بھی عبادت ہواور ہماری دیویوں اور دیوتاؤں کی بھی، اوران دونوں کی عبادت میں آپ کی بھی شرکت ہواور ہم سب کی بھی، قرآن مجید نے بتایا کہ یہ دونوں فارمولے قابل عمل نہیں ہیں؛ چوں کہ توحید وشرک ایک دوسرے کی ضد ہیں، جس طرح دن ورات اور روشنی وتاریکی ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے، اسی طرح توحیداور شرک کا جمع ہونا بھی ممکن نہیں؛ البتہ قرآن مجید نے ایک تیسرا فارمولہ پیش کیا کہ اگراہل مکہ ایمان لانے پر تیار نہیں ہیں تو یہ بات قابل عمل ہوسکتی ہے کہ مشرکین اپنے دین پرعمل کریں اور مسلمانوں کو ان کے مذہب پرعمل کرنے کی اجازت دیں ''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ'' (الکافرون:٦) —— اس طرح ایک ایسا تکثیری معاشرہ وجود میں آسکتا ہے، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بقائے باہم کے اصول پرامن کے ساتھ زندگی گذاریں۔

حضرات! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کی دوسری مثال ہجرت حبشہ کا واقعہ ہے، حبشہ میں حکومت کا مذہب عیسائیت تھا، اگرچہ ٦ رہجری کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی مکتوب سے متاثر ہوکر حبشہ کے فرمانروا اِصحمہ نجاشی نے اسلام قبول کرلیا تھا؛ لیکن جس وقت مسلمانوں نے ہجرت کی اس وقت بادشاہ عیسائی تھا اور نجاشی کے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی حبشہ کے لوگ یا پورے حکمراں گروہ کے ایمان لانے کا ذکر نہیں ملتا؛ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کی وفات پر غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی؛ البتہ نجاشی ایک عادل اور انصاف ور حکمراں تھا اوراس نے مسلمانوں کو مذہبی آزادی اور شہریوں کو حاصل ہونے والے دوسرے حقوق کے ساتھ حبشہ میں رہنے کی اجازت دی تھی، اسی لئے حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حکومت حبشہ کے ساتھ دلی ہمدردی

رکھتے تھے اور جب ان پر بعض دشمنوں نے حملہ کیا اور جنگ کی نوبت آئی تو ان کے لئے دُعاء بھی فرماتے تھے۔

کثیر مذہبی معاشرہ کی تیسری نظیر 'میثاق مدینہ' ہے، جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو اس وقت مدینہ میں تین قومیں آباد تھیں، مسلمان، یہودی اور مشرکین؛ چنانچہ آپ نے ایک معاہدہ کرایا، جس کا حاصل یہ تھا کہ مدینہ میں رہنے والے تمام گروہوں کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی اجازت ہوگی؛ لیکن جب مدینہ پر کوئی بیرونی دشمن حملہ کرے گا تو سب مل کر مدینہ کا دفاع کریں گے، اس معاہدہ پر آپ نے یہودیوں اور عربوں کے تمام قبائل سے دستخط کروائے، پھر رفتہ رفتہ مدینہ کے مشرکین اپنی مرضی سے مسلمان ہوگئے اور یہودیوں کے ساتھ آپ نے اس معاہدہ کو اس وقت تک قائم رکھا، جب تک ان کی طرف سے کھلی ہوئی بدعہدی اور وعدہ خلافی کی نوبت نہیں آگئی۔

غرض کہ کم سے کم یہ تین مثالیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ایک ایسے معاشرہ کی ملتی ہے، جس میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا موقع فراہم کیا گیا، ان میں سے خاص کر مکہ اور حبشہ کی مثالیں مسلمان اقلیت کے اکثریت کے ساتھ تعلقات کی بنیاد فراہم کرتی ہیں، پھر اس تکثیری معاشرہ کے تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق مقرر فرمائے اور انھیں نہ صرف جان و مال، عزت وآبرو، معاشی جدوجہد وغیرہ میں آزادی عطا کی؛ بلکہ انھیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کا بھی پورا پورا حق دیا گیا، یہ اس طریقۂ عمل کے بالکل برعکس تھا، جو اس زمانہ کی حکومتوں میں مروج تھا اور جس میں مذہبی اقلیتوں کو کوئی حق حاصل نہیں ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جتنی مسلم حکومتیں قائم ہوئیں، ان کے زیر سایہ مختلف مذاہب پر یقین رکھنے والے لوگوں نے امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کی اور اس حکومت کو اپنے لئے سایۂ رحمت سمجھا، شام سے لے کر اسپین تک

ہر جگہ عیسائیوں کو پوری آزادی دی گئی ، ہندوستان میں ہندو بھائیوں کے حقوق اورخاص کر ان کی مذہبی آزادی کا پورا پاس ولحاظ رکھا گیا، یہود جب عالم عیسائیت کے ظلم وجور کا نشانہ تھے اور انھیں مختلف علاقوں میں مارے مارے پھرنا پڑتا تھا، اس وقت ان کے لئے سب سے محفوظ پناہ گاہ عالم اسلام ہی تھی ، جہاں وہ اپنے تمام تشخصات کے ساتھ باعزت طور پر زندگی گذارتے تھے ؛ اس لئے شریعتِ اسلامی میں مسلمانوں کے لئے بہ حیثیت اقلیت برادرانِ وطن کے ساتھ زندگی گزارنے کے اُصول کی رہنمائی بھی ہے اور ایک ایسے کثیر مذہبی سماج کا تصور بھی ، جس میں مسلمانوں کے زیر اقتدار غیر مسلم حضرات پوری آزادی ، انسانی حقوق اور عزت نفس کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔

حضرات ! مسلمان جب کسی مشترکہ معاشرہ میں رہتے ہیں تو عموماً اور جب وہ اس معاشرہ میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو خصوصاً مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط کے سلسلہ میں تین بنیادی اُصولوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، اول: انسانی وحدت ، دوسرے: ہم وطنی کے حقوق اور تیسرے: اسلامی تشخصات کی حفاظت۔

انسانی وحدت

اسلام کا بنیادی عقیدہ ''وحدتِ اِلٰہ'' ہے، یعنی خدا ایک ہے اور وہی پوری کائنات کا خالق ہے، مخلوق خواہ کتنی بھی عظیم ہو وہ خدا نہیں ہوسکتی ، یہ اسلام کے تمام افکار کی بنیاد اور احکامِ شریعت کی جڑ اور اصل ہے، ''وحدتِ اِلٰہ'' ہی سے دوسرا تصور ''وحدتِ انسانیت'' کا پیدا ہوتا ہے، یعنی جب تمام انسان خدا کی مخلوق اور اس کے محتاج ہیں تو وہ سبھی پیدائشی اعتبار سے درجہ و مرتبہ میں یکسانیت کے حامل ہیں ؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں ان دونوں حقیقتوں کو جمع کرتے ہوئے فرمایا: ''إن أباکم واحد، وإن ربکم واحد وکلکم من آدم وآدم من تراب'' یعنی تم سب کا رب ایک ہے، اور تم سب

کے باپ بھی ایک ہی ہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، قرآن مجید میں انسانی وحدت کے اس تصور کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا :

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۔ (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیئے۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا گیا :

وَهُوَ الَّذِىْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۔ (الانعام:۹۸)

اور وہی ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔

اسلام سے پہلے مختلف مذاہب نے خاندانی بنیاد پر برتری اور کہتری کا مصنوعی تصور قائم کر رکھا تھا، عرب عجم کو حقیر سمجھتے تھے، اسرائیلیوں کے نزدیک غیر اسرائیلی ایک کمتر درجہ کی مخلوق تھے اور اصل میں وہ بنی اسرائیل کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے تھے، ہندو مذہب میں تو سماجی تفریق اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی، جہاں 'برہمن' معبودوں کا مقرب ترین گروہ تھا، وہیں 'شودر' ایسے بدقسمت تھے کہ ان کے کانوں کو 'ویدوں' کے سننے کی بھی اجازت نہ تھی، اسی طرح ایرانی اپنے آپ کو ایک بالاتر مخلوق تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک آریائی حکومت کرنے ہی کے لئے پیدا کئے گئے تھے اور شاہی خاندان کے بارے میں تو ان کا خیال تھا کہ ان کی رگوں میں خدا کا خون دوڑتا ہے، ان حالات میں شریعتِ محمدی (

صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں آئی اور قرآن نے اعلان کیا کہ خاندان تعارف اور پہچان کے لئے ہے، اس سے عظمت وحقارت کا تعلق نہیں ہے اور نہ ان کو تفاخر کا سبب سمجھنا جائز ہے :

إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ (الحجرات:۱۳)

ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں؛ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

اسلام نے ایک بنیادی اور انقلابی فکر دی کہ جو چیزیں بطور اتفاق کے انسان کو حاصل ہوتی ہیں، جیسے کسی کا سفید فام یا سیاہ فام ہونا، یا عربی اور عجمی ہونا، ان کی وجہ سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی؛ بلکہ فضیلت اور عزت و مرتبت کا معیار اکتسابی چیزیں ہیں، جن کے حاصل کرنے میں انسان کی محنت اور اس کے اختیار کو دخل ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے :

لا فضل لعربي على عجمي ولا لأبيض على أسود، إن أكرمكم عند الله أتقاكم۔

کسی عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، اللہ کے نزدیک تم سے سب سے زیادہ باعزت وہ ہے، جو سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو۔

انسانی وحدت کا یہ تصور عالمگیر انسانی اُخوت اور بھائی چارہ کو وجود میں لاتا ہے، اس لئے کوئی شخص مسلمان ہو یا غیر مسلم 'انسانی اُخوت' اسے ایک ڈوری میں پرو دیتی ہے، اسلامی تصور کے تحت وہ ایک دوسرے کا بھائی ہے، سارے انسان انسانیت کے وسیع کنبہ کا حصہ اور ایک وسیع تر انسانی خاندان کے افراد ہیں؛ اسی لئے قرآن نے بحیثیت انسان ہر ابن آدم کو قابل احترام قرار دیا ہے :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ (بنی اسرائیل:۷۰)

ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے۔

نیز اس کے نزدیک تخلیق کے اعتبار سے انسانی ڈھانچہ بہترین قالب ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ (التین:۴)

ہم نے انسان کو بہترین قالب میں پیدا کیا ہے۔

یہ تکریم واحترام تمام بنی نوعِ انسانی سے متعلق ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اس حقیقت کو واضح فرمایا، ایک بار ایک یہودی کا جنازہ جارہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جان تو اس میں بھی ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۳۱۲، باب من قام رجنازة یہودی) غزوۂ احزاب کے موقع سے ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، اہل مکہ نے خواہش کی کہ اس کی قیمت لے کر نعش ان کے حوالہ کردیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی قیمت لئے بغیر نعش واپس کردی؛ کیوں کہ انسانی نعش کی قیمت وصول کرنا انسانی احترام کے مغائر ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی قانون نہیں تھا اور لوگ مقتول کے اعضاء تراش کر ہار پہنتے اور اپنی آتش انتقام بجھاتے تھے، اسلام نے ایک تو حتی المقدور جنگ سے بچنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر اس کی نوبت آ ہی جائے تو جنگ کے مہذب قوانین مقرر کئے، من جملہ ان کے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرفت میں آجائے تو ایذاء پہنچا پہنچا کر قتل نہ کیا جائے اور جو مارے جائیں، ان کے اعضاء کاٹے نہ جائیں کہ یہ احترامِ انسانیت کے خلاف ہے۔

کافر و ذمی کا لفظ اہانت آمیز نہیں

اسلام بحیثیتِ انسان کسی غیر مسلم کی توہین وتحقیر کو بھی رَوا نہیں رکھتا، بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ غیر مسلم کے لئے ''کافر'' اور ''ذمی'' کا لفظ استعمال کر کے ان کی تحقیر کی گئی ہے، اسی طرح آج کل بعض غیر مسلم بھائی ''کافر'' کے لفظ کو اہانت آمیز اور حقارت

انگیز خیال کرتے ہیں، یہ محض غلط فہمی اور پروپیگنڈہ ہے، ''کفر'' کے معنی انکار کے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ انکار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ منکرین آخرت کے بارے میں ارشاد ہوا: ''وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كَافِرُوْنَ'' (یوسف:٣٧) اہل مکہ کو ان باتوں سے انکار تھا، جن کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیا کرتے تھے؛ اس لئے وہ کہتے تھے: ''اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ'' (الزخرف:٢٤) یعنی: ''آپ جس دین کو لے کر بھیجے گئے ہیں، ہم اس کا انکار کرتے ہیں'' اسی طرح جادو کے انکار پر بھی کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، چنانچہ بعض انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا قول نقل کیا گیا ہے :

قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كَافِرُوْنَ۔ (الزخرف:٣٠)

انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

پس ''کافر'' کے معنی انکار کرنے والے، یعنی ایسے شخص کے ہیں، جو توحید اور اسلامی تعلیمات کو قبول نہیں کرتا ہو، گویا یہ غیر مسلم "Non Muslim" کا ہم معنی لفظ ہے، پس یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے نہ کہ کسی شخص کی توہین، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس عہد کے غیر مسلموں کو ''کافر'' کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے؛ لیکن انھوں نے اس کا برا نہیں مانا، اگر یہ لفظ اہانت آمیز ہوتا تو یقینا انھوں نے اس طرزِ تخاطب پر اعتراض کیا ہوتا، پھر باوجودیکہ یہ لفظ اہانت آمیز نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو ''اے کافر!'' کہنے سے ایذاء ہوتی ہو، تو اس شخص کو اس طرح خطاب نہ کیا جائے اور اگر کرے گا، تو گنہگار ہوگا :

ولو قال لذمي ياكافر! يأثم ان شق عليه ۔

(الأشباء والنظائر: ٢/٢٥٧)

اگر کسی نے کسی ذمی کو اے کافر کہہ کر پکارا اور اس پر یہ گراں

گذرتا ہو تو اے کافر کہنے والا شخص گناہ گار ہو گا۔

اسی طرح عربی زبان میں ''ذمۃ'' کے معنی ''عہد'' کے ہیں، ''ذمی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی حفاظت کا عہد کیا جائے، چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت ''لسان العرب'' میں ہے :

رجل ذمی، معناه له عهد۔ (لسان العرب:۵/۵۹)

''مردِ ذمی'' کے معنی ایسے شخص کے ہیں، جس کے لئے عہد کیا گیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن اثیرؒ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ غیر مسلم اقلیت کو اہل ذمہ کیوں کہا جاتا ہے؟ رقمطراز ہیں :

سمی أهل الذمة لدخولهم فی عهد المسلمین و أمانهم ۔ (النهاية:۲/۱۶۸)

اہل ذمہ اس لئے نام رکھا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی امان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اس لئے یہ محض غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید اور حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں غیر مسلموں کے لئے اہانت آمیز تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

ہم وطنوں کی حیثیت

حضرات! انسان دنیا میں اپنے لئے ایسی جگہ کا محتاج ہوتا ہے، جہاں اس کا مستقل قیام ہو سکے اور انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ جہاں پیدا ہوتا ہے اور بود و باش اختیار کرتا ہے، اس سرزمین سے اسے ایک محبت اور خصوصی نسبت سی ہو جاتی ہے، یہ محبت کوئی مذموم عمل نہیں ہے؛ چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سرزمین مکہ سے بڑی محبت تھی، جب آپ نے مکہ سے ہجرت کی تو مکہ سے نکلتے ہوئے ارض مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

ما أطيبک من بلد ، و أحبک إلی ، و لو لا أن قومی أخرجونی منک ماسکنت غیرک ۔ (ترمذی ، کتاب المناقب ، مسند ابویعلی: ۵/ ۶۹ ، وصحیح ابن حبان: ۳۷۰۹ ، وقال الهيثمی فی مجمع الزوائد: رواه أبويعلی ورجاله ثقات: ۳/ ۶۱۵ ، بلفظ قريب)

تو کتنا پاکیزہ اور مجھے کس قدر محبوب شہر ہے، اگر میری قوم نے مجھے تیری زمین سے نکالا نہ ہوتا تو میں کہیں اور مقیم نہ ہوتا۔

پھر جب آپ نے مدینہ منورہ کو اپنا وطن بنایا تو دُعاء فرمائی :

اللهم حبب إلينا المدينة كما حببت مكة أو أشد ۔ (بخاری، کتاب المرضی، باب من دعا برفع الوباء والحمی، ومسلم، کتاب الحج، ومسند احمد، حدیث السیدة عائشة رضی اللہ عنہا)

اے اللہ! جیسے مکہ کی محبت آپ نے میرے اندر پیدا فرمائی تھی، ویسی ہی؛ بلکہ اس سے بڑھ کر محبت ہمارے دل میں مکہ کی پیدا فرمادے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ سے ایسی محبت ہوئی کہ جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے اور مدینہ کے کنارے پر واقع کوہِ اُحد پر نظر پڑتی تو آپ کا روئے انور چمک اُٹھتا اور سواری کی رفتار تیز ہوجاتی؛ یہاں تک کہ مکہ کے فتح ہوجانے کے بعد بھی آپ نے مدینہ کو اپنا وطن باقی رکھا؛ بلکہ مکہ میں نماز سفر ادا فرمائی اور حج وعمرہ کے موقع سے جب بھی مکہ تشریف آوری ہوئی، آپ نے وہاں حسبِ ضرورت ہی قیام فرمایا، غرض کہ وطن سے محبت اگر شرعی حدود میں ہو اور ناانصافی اور تعصب کا باعث نہ بنے تو بری بات نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب وطن سے محبت ہوگی تو اہل وطن سے محبت ہونا بھی فطری بات ہے اور ان میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہوں گے؛ اسی لئے اسلام میں جس طرح اُخوت

کا ایک دائرہ مسلمانوں کے درمیان ہے، اسی طرح جو ہم وطن ہیں، وہ بھی ہمارے بھائی ہیں، — بعض حضرات کو خیال ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو کیسے بھائی کہا جا سکتا ہے؟ لیکن قرآن مجید کی تعبیر کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے اور ہم وطنوں کے ساتھ بھی مسلمان ''وطنی اُخوت'' کا رشتہ رکھتے ہیں، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کو ان کی ہم وطن قوموں کا بھائی قرار دیا گیا، اس سلسلہ میں یہ آیتیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں :

○ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحِ نِ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ (الشعراء:۱۰۵-۱۰۶)

قومِ نوح نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا تھا ''کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟''

○ كَذَّبَتْ عَادُنِ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُوْدٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ (الشعراء:۱۲۳-۱۲۴)

عاد نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا تھا ''کیا تم ڈرتے نہیں؟''

○ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ ، صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ (الشعراء:۱۴۱-۱۴۲)

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا تھا ''کیا تم ڈرتے نہیں؟''

○ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ نِ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ ، لُوْطٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ (الشعراء:۱۶۰-۱۶۱)

لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی

لوط نے ان سے کہا تھا ’’کیاتم ڈرتے نہیں؟‘‘

اس سلسلہ میں یہ نکتہ خاص طور پر غور کئے جانے کے لائق ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے دوقوموں میں دعوت حق کا فریضہ انجام دیا، ایک مدین نامی شہر کے باشندوں میں، جس سے آپ کا وطنی تعلق تھا، دوسرے اصحابِ ایکہ میں، تو قرآن نے جہاں اہل مدین میں حضرت شعیب کی دعوت کا ذکر کیا ہے وہاں خاص طور پر رشتۂ اُخوت کا ذکر فرمایا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَ إِلٰی مَدْیَنَ أَخَاهُمْ شُعَیْباً۔ (الأعراف:۸۵، ہود:۸۴، العنکبوت:

۳۶)

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔

— اور جہاں اصحابِ ایکہ میں دعوت کا ذکر ہے وہاں رشتۂ اُخوت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے؛ کیوں کہ حضرت شعیب علیہ السلام وہاں کے رہنے والے نہیں تھے :

كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ، إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلاَ تَتَّقُوْنَ۔ (الشعراء:۱۷۶-۱۷۷)

اصحاب الایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ شعیب نے ان سے کہا تھا ’’کیاتم ڈرتے نہیں؟‘‘

غرض کہ جیسے انسانی اُخوت کا عالمگیر رشتہ پوری دنیا کے انسانوں کے درمیان وسیع تر بھائی چارہ کی تشکیل کرتا ہے، اسی طرح ایک دائرہ وطنی اُخوت کا بھی ہے، جو تمام ہم وطنوں کو بھائی بھائی قرار دیتا ہے، خواہ مذہب کے اعتبار سے ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہو۔

اسلامی تشخصات کی حفاظت

بزرگانِ محترم ! مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، ضروری ہے کہ ان پر دین کی محبت تمام محبتوں؛ یہاں تک کہ خونی رشتوں پر بھی مقدم ہو؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا اٰبَاءَ كُمْ وَإِخْوَانِكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوْا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيْمَانِ ، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ۔(التوبۃ:۲۳)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں، تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔

اسی لئے کسی مسلمان کے لئے قطعاً اس بات کی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی بھی دوسرے تعلق پر دین کے تعلق کو قربان کردے، یہی وجہ ہے کہ جب بھی انبیاء اور ان کے متبعین کے لئے اپنے وطن میں رہ کر دین حق پر عمل کرنا مشکل ہوگیا، انھیں وہاں سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا گیا، سیدنا حضرت ابراہیم، حضرت شعیب، حضرت موسیٰ، حضرت لوط اور حضرت صالح — علیہم الصلوٰۃ والسلام — وغیرہ کی ہجرت کے واقعات قرآن مجید میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، نیز تحفظ دین ہی کے لئے مسلمانوں کو بھی مکہ سے ہجرت کرنے کا حکم فرمایا گیا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ ، وَأَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا ، وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا ، وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ ، فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللهُ بِأَمْرِهٖ ، وَاللهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ۔(التوبۃ:۲۴)

اے نبی ! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ

گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

اس لئے اسلام مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کثیر مذہبی معاشرہ میں رہتے ہوئے بھی اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھیں اور برادرانِ وطن کے ساتھ اپنی پہچان کو گم نہ کرلیں، یہی روح ہے اس بات کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری اقوام کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے؛ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے :

لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا ، لَاتَشَبَّهُوا بِالْيَهُوْدِ وَ لَا بِالنَّصَارىٰ الخ۔(الجامع للترمذی، حدیث نمبر : ۲۶۹۵، کتاب الاستیذان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے ، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو۔

اس تشبّہ اور مماثلت کے چار مدارج ہو سکتے ہیں :

(الف) دوسری قوموں کے مذہبی شعائر میں مماثلت اختیار کی جائے ، جیسے مسلمان صلیب یا زنار پہننے لگیں ، یا سکھوں کے جو مخصوص شعائر ہیں، ان کو استعمال کریں، فقہاء نے اسے باعثِ کفر قرار دیا ہے؛ چنانچہ مجوسی خاص قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے، فقہاء نے اس کے بارے میں کہا ہے :

وَ لَوْ وَضَعَ عَلٰى رَأْسِهٖ قَلَنْسُوَةَ الْمَجُوْسِ كَفَرَ ۔
(الملتقط فی الفتاوی الحنفیة: ۲۴۵)

اگر اپنے سر پر مجوسیوں کی خاص ٹوپی پہنے تو یہ کفر ہے۔

فقہاء کے یہاں زنار کے بارے میں بھی اسی طرح کی صراحت ملتی ہے، ہندوستان میں قشقہ لگانے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیوں کہ وہ ہندو بھائیوں کے مذہبی شعائر میں سے ہے۔

(ب) غیر مسلم مذہبی تہواروں میں شرکت — یہ اگر یوں ہی ہو یا اس کا مقصد اپنے گمان کے مطابق رواداری ہو، تب بھی جائز نہیں اور اگر ان کے مذہبی معتقدات اورافعال پر خوشنودی و رضامندی کا اظہار اور تائید و تحسین مقصود ہو، تو کفر ہے: ''إنَّمَا الرِّضَا بِالْكُفْرِ مُسْتَحْسِنًا كُفْرٌ'' (الملتقط: ۲۴۵) — کوئی شخص جس مذہب پر عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنے عقیدہ کے مطابق اس کو نادرست خیال کرتا ہو، اس میں شرکت اور اس پر رضامندی وخوشنودی کا اظہار کھلی ہوئی دوعملی اور نفاق کی بات ہے؛ اس لئے اسلام نہ مسلمانوں کے لئے اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ ایسا منافقانہ رویہ اختیار کریں اور نہ غیر مسلموں سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اسلامی شعائر کو اختیار کریں اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوں ۔

(ج) تیسرا درجہ 'تہذیبی تشبّہ' کا ہے، یعنی ایسی وضع قطع اور لباس، جو کسی خاص قوم کی شناخت بن گئی ہو اور اس کا مذہب سے تعلق نہ ہو، کو اختیار کرنا، جیسے ہندوستان میں دھوتی، کہ اس کا مذہب سے تعلق نہیں؛ لیکن یہ ہندو بھائیوں کی پہچان سی بن گئی ہے، اگر کسی کو دھوتی میں ملبوس دیکھا جائے تو ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ وہ ہندو ہے، ایسی مشابہت اور مماثلت اختیار کرنا مکروہِ تحریمی ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔
(دیکھئے: اقتضاء الصراط المستقیم: ۱/۹۴)

لیکن تشبّہ کی اس جہت میں تبدیلی آتی رہتی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی وضع ایک عہد میں کسی قوم کی پہچان بن گئی ہو اور بعد کو اس کا استعمال عام ہو جائے اور وہ کسی خاص مذہبی گروہ کی شناخت باقی نہ رہ جائے تو پھر تشبّہ کی کیفیت ختم ہو جائے گی اور اس کا استعمال جواز کی حد میں آجائے گا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کوٹ، پینٹ کے بارے میں (امداد الفتاویٰ:

۲۶۸/۴ سوال نمبر ۳۴۴۵) اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ساری کے متعلق یہی لکھا ہے۔(کفایت المفتی:۱۶۱/۹)

(د) جو ملبوسات اور تقریبات کسی خاص مذہبی گروہ کی پہچان نہیں ہیں، ان کے اختیار کرنے اور ان میں شریک ہونے کی گنجائش ہے، بہ شرطیکہ کسی اور سبب سے شریعت نے ان کو منع نہیں کیا ہو، اسی طرح انتظام وانصرام سے متعلق اُمور، جیسے طرزِ تعمیر، دفتری نظم و نسق، تجارتی طور وطریق وغیرہ، میں غیرمسلم بھائیوں کے طریقۂ کار سے استفادہ کرنے میں کچھ حرج نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حساب و کتاب کے نظام میں روم و ایران کے طریقوں سے استفادہ کیا تھا، (الفاروق مکمل: ۱۳۰/۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر اہل فارس کے طریقہ پر خندق کھودوائی تھی۔(البدایۃ والنہایۃ: ۹۵/۴)

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ایسے امور میں غیرمسلم بھائیوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔

تشبّہ اور مماثلت سے بچنے کا جو اصولی حکم شریعتِ اسلامی میں دیا گیا ہے، وہ تعصب اور تنگ نظری پر مبنی نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ شناخت کی حفاظت ایک فطری عمل ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی صورت اور آواز کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، انسان کے اندر شناخت کی حفاظت کا جذبہ اتنا بے پناہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی شناخت الگ رکھنا چاہتی ہے، اپنے تمدن کی حفاظت کرتی ہے، اپنے جھنڈے الگ رکھتی ہے، ہر اسکول اپنا مستقل یونیفارم رکھتا ہے، گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے الگ الگ یونیفارم ہوتے ہیں، یہ سب شناخت ہی سے متعلق ہیں؛ اس لئے اپنی شناخت کی حفاظت کوئی مذموم عمل نہیں ہے اور نہ اس میں دوسروں کی مخالفت اور ان کے تئیں تنگ نظری کا اظہار ہے، اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی پہچان کو باقی رکھیں اور جہاں اسلامی نظام نافذ ہو، وہاں غیر

مسلم بھائیوں کو بھی اس بات کی پوری آزادی فراہم کی جائے کہ وہ اپنی مذہبی وتہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گذاریں۔

مذہبی شناخت کی حفاظت ہی سے متعلق ایک اہم مسئلہ شریعت اسلامی پر عمل کا بھی ہے۔

شریعت اسلامی پر عمل

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، مسلم ممالک میں یا غیرمسلم ممالک میں، دین کے چار شعبوں میں ان کے لئے قانونِ شریعت کا التزام ضروری ہے، اعتقادات، عبادات، احوالِ شخصیہ اور معاملات۔

اعتقادات سے مراد وہ احکام ہیں، جن کا تعلق قلب وضمیر سے ہو، جیسے: توحید، رسالت، آخرت کا یقین وغیرہ۔

''عبادات'' سے وہ احکام مراد ہیں، جن کا تعلق براہِ راست خدا اور بندے کے باہمی ارتباط سے ہے، جیسے: نماز، روزہ وغیرہ۔

''احوالِ شخصیہ'' سے مراد Parasnal Law ہے، اس میں نکاح وطلاق کے علاوہ میراث، وصیت اور مختلف اقارب سے متعلق حقوق وفرائض بھی آجاتے ہیں۔

''معاملات'' سے مراد مالی بنیاد پر دو افراد کے تعلقات ومعاہدات ہیں: تجارت، اجارہ، ہبہ وغیرہ اس شعبہ کے تحت آتے ہیں اور سود وقمار جیسے حرام معاملات بھی اسی دائرہ میں ہیں۔

یہ تمام قوانین وہ ہیں کہ چاہے مسلم اکثریت ملک ہو یا غیرمسلم اکثریت ملک، اور کلیدِ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو یا نہیں ہو، مسلمانوں کے لئے ان قوانین میں شریعتِ اسلامی کی اطاعت واجب ہے، جو قوانین اجتماعی نوعیت کے ہوں، یا جرم وسزا سے متعلق

ہوں، جیسے حدود، قصاص، نظامِ مملکت وغیرہ، ان شعبوں سے متعلق شرعی قوانین وہیں قابل نفاذ ہیں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور باگِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو، پس غیر مسلموں سے تعلقات ان قوانین پر عمل آوری کے حق سے دست برداری اور محرومی کی قیمت پر استوار نہیں کئے جاسکتے اور اس سلسلہ میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے کا مطالبہ فی نفسہٖ نامعقول بھی ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کے ان پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے غیر مسلم بھائیوں کو نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔

یہ تین بنیادی اُصول ہیں، انسانی وحدت کا تصور، وطنی اُخوت کا تصور اور مذہبی شناخت کی حفاظت —— ان کی روشنی میں مسلمان اقلیت کے غیر مسلموں سے تعلقات کے بارے میں غور کیا جاسکتا ہے، یہاں اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ غیر مسلم اقلیت (ذمی) کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں اسلام میں جو تعلیمات دی گئی ہیں اور جن کا فقہاء نے ذکر کیا ہے وہ غیر مسلم اکثریت کے ساتھ روابط کے سلسلہ میں بھی ہمیں رہنمائی کرتی ہیں؛ کیوں کہ غیر مسلم اقلیت کے ساتھ جس حسن سلوک کی دعوت دی گئی ہے اس میں تو احسان اور حسن سلوک پیش نظر ہے اور غیر مسلم اکثریت کے ساتھ روابط سے قومی، ملی اور مذہبی مفادات کا تحفظ بھی متعلق ہے، اس لئے ان کے ساتھ تو بدرجۂ اولیٰ ہمیں بہتر روابط رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

باہمی روابط و تعلقات

برادرانِ اسلام! جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی روابط کی بات ہے تو اس موضوع کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: سماجی تعلقات، معاشی تعلقات، سیاسی تعلقات اور مذہبی تعلقات، تعلقات کے ان تمام دائروں کے سلسلے میں قرآن و حدیث سے ہمیں تفصیلی رہنمائی ملتی ہے۔

سماجی تعلقات

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِیْ الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ ، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔ (الممتحنة:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انھوں نے تم کو تمہارے گھر سے نکالا ہے، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے ، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے یہ بات واضح ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں ، مسلمانوں پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرنا ضروری ہے،قرآن نے صاف کہا ہے کہ کسی قوم کا ہدایت کے راستہ پر آنا اور دین حق کو قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے ؛ لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک سے رک جانا درست نہیں ، مسلمان ان کے ساتھ جو بہتر سلوک کریں گے، انھیں بہرحال اس کا اجر مل کر رہے گا :

لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدَاھُمْ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ ، وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْہِ اللّٰہِ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔

(البقرة:۲۷۲)

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم جو کچھ مال خرچ کرتے ہو، وہ اپنے

ہی لئے ،اور خرچ نہیں کرتے ہو مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں
،اور جو بھی خرچ کروگے تم کو پورا پورا دیا جائے گا ، (یعنی اس کا
اجر ملے گا) اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض انصار کی بنوقریظہ اور بنونضیر کے یہودیوں سے قرابت تھی، انصاران پر اس لئے صدقہ نہیں کیا کرتے تھے کہ جب ضرورت مند ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے، (تفسیر قرطبی: ۳/۷ ۳۳) اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویہ کو پسند نہیں کیا اور فرمایا گیا کہ ان کی ہدایت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے؛ لیکن تم کو اس کی وجہ سے اپنا دستِ تعاون نہ کھینچنا چاہیے؛ کیوں کہ تم کو تمہارے انفاق کا اجر مل کر رہے گا۔

آپ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء نے عملی طور پر اس کو برت کر دکھایا، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے، یہ زمانہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف اور گرما گرمی کا تھا، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لئے پانچ سو دینار بھیجے؛ حالاں کہ اس وقت خود مدینہ کے مسلمان سخت مالی دقتوں اور فاقہ مستیوں سے دوچار تھے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رقم سردارانِ قریش ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کو بھیجی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین مکہ کی قیادت کر رہے تھے۔ (ردّالمحتار: ۳/۳۰۲، باب المصرف)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ہمیں جزیہ ادا کرنا ہے، حضرت عمرؓ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا: ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے، ''**ما أنصفناک أکلنا شیبتک، ثم نأخذ منک الجزیة**'' (نصب الرایة: ۳/۴۵۴)؛ چنانچہ فقہاء کے یہاں اس پر تو قریب قریب اتفاق ہے کہ صدقاتِ نافلہ غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ

دوسرے صدقاتِ واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیے جاسکتے ہیں۔

(دیکھئے: الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۳۰۱/۳)

غرض کہ مسلمانوں کا رویہ اپنی غیر مسلم اکثریت کے ساتھ حسن سلوک کا ہونا چاہئے، اور مالی اعانت وغمخواری میں ان کو بھی شریک کرنا چاہئے۔

انسانی زندگی کا احترام وتحفظ

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن وامان کا ہے اور امن وامان کا تعلق جان ومال اور عزت وآبرو سے ہے؛ چنانچہ شریعتِ اسلامی میں غیر مسلموں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو وہی اہمیت دی گئی ہے، جو مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو حاصل ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں:

دِمَائُھُمْ کَدِمَائِنَا، وَ أَمْوَالُھُمْ کَأَمْوَالِنَا۔

(نصب الرایۃ: ۳۶۹/۴)

چنانچہ قرآن مجید نے مطلق نفس انسانی کے قتل سے منع کیا ہے، ارشاد ہے:

لَاتَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلاَّ بِالْحَقِّ۔

(بنی اسرائیل: ۳۳)

کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔

ایک اور موقع پر کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا:

مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِیْ الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعاً۔ (المائدہ: ۳۲)

جس نے کسی نفس انسانی کو کسی دوسرے کے بدلے یا زمین میں
فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔

کیوں کہ اگر کوئی شخص ایک بے قصور شخص کو قتل کر سکتا ہے تو وہ انسانیت کے کسی بھی فرد کو قتل و غارت گری کا نشانہ بنا سکتا ہے؛ اس لئے گویا وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے، ان آیات میں مسلمان اور غیرمسلم کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے غیرمسلم ـــــ جس سے امن اور بقاءِ باہم کا معاہدہ ہو ـــــ کے قاتل کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا :

مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ، وَاِنَّ رِيْحَهَا يُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ أَرْبَعِيْنَ عَامًا۔

(بخاری عن عبداللہ بن عمروؓ، حدیث نمبر:۳۱۶۶)

جس نے کسی معاہد (وہ غیرمسلم جس سے پُرامن زندگی گزارنے کا معاہدہ ہو) کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا؛ حالاں کہ اس کی بو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جا سکتی ہے۔

اگر کوئی مسلمان غیرمسلم کو قتل کر دے تو مسلمانوں کو بھی اس کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا؛ کیوں کہ قرآن مجید نے علی الاطلاق قصاص کا یہی اصول بتلایا ہے، جو شخص دوسرے شخص کا قاتل ہو، وہ اس کے بدلے قتل کیا جائے گا: ''اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ'' (المائدہ:۴۵) اس میں مسلمان اور غیرمسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک غیرمسلم (ذمی) کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا، (مصنف عبدالرزاق:۱۰/۱۰۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں

مروی ہے کہ انھوں نے ''ذمی'' کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا، (مصنف عبد الرزّاق:۱۰/ ۱۰۱) امام شافعیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے بعض اہل ذمہ کو قتل کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا۔ (مسند امام شافعی، السنن البیہقی: ۱۲/ ۴۳)

اگر مقتول کے ورثاء سزاءِ قید کو معاف کردیں، یا قتل کے واقعہ میں قصد وارادہ کو دخل نہ ہو؛ بلکہ غلطی سے قتل کا ارتکاب ہوا ہو تو ان صورتوں میں قصاص کے بدلہ خون بہا (دیت) واجب ہوتا ہے؛ چنانچہ خون بہا بھی مسلمان اور غیر مسلم کا یکساں ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپؐ نے غیر مسلم کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا کی، (سنن دار قطنی، کتاب الحدود) حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت اسامہ بن زید اور مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کی دیت برابر ہوگی، علامہ زیلعیؒ نے تفصیل سے ان روایتوں کو نقل فرمایا ہے۔ (دیکھئے: نصب الرایہ: ۴/ ۶۸-۳۶۹)

ظاہر ہے کہ جان اور زندگی کے احترام میں اکثریت اور اقلیت کا کوئی فرق نہیں ہے؛ بلکہ بہ حیثیت انسان ہر شخص کی زندگی کا احترام واجب ہے، سوائے اس کے کہ کسی شخص نے اپنی مجرمانہ حرکتوں کی وجہ سے اپنے اس حق کو کھو دیا ہو۔

املاک کا احترام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصول مقرر فرمایا کہ غیر مسلموں کی جانیں مسلمانوں کی جانوں کی طرح ہیں اور ان کے مال مسلمانوں کے مالوں کی طرح ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی املاک بھی اسی طرح قابل احترام ہیں جیسا کہ مسلمانوں کی، بغیر رضامندی کے نہ کسی مسلمان کا مال لیا جاسکتا ہے نہ کسی غیر مسلم کا ''اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ''۔ (النساء:۲۹)

فتح خیبر کے موقع سے بعض مسلمان فوجیوں نے یہودیوں کے جانور ذبح کردیئے

اور کچھ پھل کھالئے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر خطاب کیا ، اس عمل پر ناگواری ظاہر کی اور فرمایا کہ یہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔(ابوداؤد،حدیث نمبر:۳۰۵۰)

متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے :

أَلاَ مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ انْتَقَصَهُ أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسٍ ، فَأَنَا حَجِيْجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔

(ابوداؤد،حدیث نمبر:۳۰۵۳)

آگاہ ہوجاؤ! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا ، اس کی حق تلفی کی یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف کیا یا اس سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر لے لی ،تو میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا۔

اسلامی قانون کی رو سے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے ، جیسے مسلمان کا مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا ، اسی طرح اگر کوئی مسلمان چور غیرمسلم کا مال چوری کرلے تو اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا ،علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے یہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے، (المغنی لابن قدامه : ۱۲/ ۴۵۱، مع تحقیق : عبدالله بن عبدالمحسن وغیره) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں مسلمان اور غیرمسلم کی ملکیت یکساں قابل احترام ہے۔

عزت وآبرو کی حفاظت

یہی معاملہ عزت وآبرو اور عفت وعصمت کی حفاظت کا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاتفریقِ مذہب ہر بڑے کی توقیر کا حکم دیا ہے اور ہر چھوٹے کے ساتھ شفقت

اور محبت کی تلقین کی ہے، مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَومٌ مِّن قَوْمٍ عَسىٰ أَن يَكُونُوا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۔

(الحجرات:۱۱)

اے ایمان والو! ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے ، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا تمسخر کریں ، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں ، نہ ایک دوسرے پر طعن کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب دو۔

اسی طرح مردوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا، (النور:۳۱) یہ حکم مطلق ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہے، معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عزت وآبرو کی بھی وہی اہمیت ہے، جو مسلمانوں کی ہے، عفت وعصمت کو مجروح کرنے والی چیزیں حرام ہیں، خواہ مسلمانوں کے ساتھ کی جائیں یا غیر مسلموں کے ساتھ، جو سزا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کی ہے، وہی سزا غیر مسلم عورت کی آبروریزی کی ہے، غرض کہ عزت وآبرو کے اعتبار سے غیر مسلم بھائیوں کو وہی درجہ حاصل ہے، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

خوشی وغم میں شرکت

سماجی تعلقات کے دائرہ میں کھانا، کھلانا، پڑھنا، پڑھانا، باہمی ملاقات، خوشی وغم کے موقع پر دلداری وغیرہ اُمور بھی آتے ہیں، اسلام نے ان تمام شعبوں میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی خوش گوار برتاؤ کا حکم دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے، (صحیح بخاری، حدیث نمبر:۲۶۱۷، باب قبول الهدية من المشركين) خود

غیر مسلموں کو دعوت دی ہے (الدر المنشور: ۱۸۱/۵) انھیں اپنا مہمان بنایا ہے (الخصائص الکبریٰ: ۱/ ۱۲۳) اپنے رفقاء کو غیر مسلم بزرگوں کی تجہیز و تکفین کے انتظام کا حکم دیا ہے (اعلاء السنن: ۸/ ۲۸۲، باب ما یفعل المسلم اذا مات له قریب کافر) نیز غیر مسلموں کی عیادت کی ہے، (صحیح البخاری، حدیث نمبر ۵۶۵۷، باب عیادۃ المشرک) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں سے متعلق جو احکام دیے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں :

- مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے، سوائے ذبیحہ کے۔
- مسلمان اور مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ نزدیک کا ہو یا دور کا، اور ذمی ہو یا حربی، حربی سے مراد وہ شخص ہے، جو دشمن ملک کا شہری ہو۔
- مسلمانوں کے لئے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرنا درست ہے۔
- یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
- جب کسی غیر مسلم کی وفات ہو جائے تو اس کے عزیز سے عیادت کے لئے یہ الفاظ کہے جائیں :

  اَخْلَفَ اللہُ خَیْرًا مِّنْہُ وَ أَصْلَحَکَ۔ (ھندیة: ۵/ ۳۸۴)

  اللہ تجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے۔

آج ضرورت ہے کہ سماجی زندگی سے متعلق تقریبات میں غیر مسلم بھائیوں کو مدعو کیا جائے اور اگر وہ دعوت دیں تو ان کی دعوت میں شرکت کی جائے؛ کیوں کہ سماجی تعلقات ہی خوشگوار تعلقات کے قیام میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

معاشی تعلقات

محترم حضرات ! معاشی تعلقات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں، نبوت کے بعد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابوسفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت کرنا منقول ہے، اسی طرح خیبر کے فتح ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کی اراضی یہودیوں کے قبضہ میں ہی رہنے دیں اور ان سے بٹائی پر معاملہ طے کرلیا، جس کا بخاری اور مختلف کتبِ احادیث میں ذکر موجود ہے، (صحیح البخاری، حدیث نمبر:۴۲۴۸، باب معاملة النبی علی اهل خیبر) مسلمانوں کے لئے یہ بات درست ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کے یہاں ملازمت کریں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کے یہاں مزدوری کی ہے، کتبِ احادیث میں اس کا ذکر ہے، (کنز العمال: ۳۲۱/۲) حضرت خباب رضی اللہ عنہ لوہاری کے فن سے واقف تھے، انھوں نے عاص بن وائل کے لئے کام کیا، اس کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے: ’’خباب کان قینا فعل للعاص بن وائل‘‘۔ (بخاری، حدیث نمبر:۲۳۷۵، مسلم، حدیث نمبر:۷۰۶۲)

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اپنے یہاں ملازمت کا موقع دیں، عرب میں سڑکوں کا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا اور پورا خطہ عرب ریت سے ڈھکا ہوا تھا، اسی لئے راستہ کی شناخت دشوار ہوتی تھی اور جن لوگوں کو شناخت نہیں ہوتی تھی، وہ سفر میں کسی راہ بتانے والے کو ساتھ لے جاتے تھے، ان کو ’دلیل‘ کہا جاتا تھا، جس کے معنی راہبر کے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک مشرک کو اپنے لئے بطورِ ’دلیل‘ اجرت دے کر ساتھ رکھا، (احکام أهل الذمة لابن قیم: ۲۰۷) اسی لئے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان غیر مسلم کو اپنے یہاں ملازم رکھ سکتے ہیں:

یجوز أن یکون الأجیر ذمیا و المستأجر مسلما بلا خلاف۔

(الموسوعة الفقهیة:۱۰۵، مادہ: اجارہ)

چنانچہ مسلم عہدِ حکومت میں غیر مسلم حضرات بڑے اونچے اور کلیدی عہدوں پر فائز

رہے ہیں، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حمص کا فینانشیل کمشنر اور حاکم ابن اَثال نامی ایک عیسائی تھا، عبدالملک بن مروان کا کاتب ابن سرجون تھا، یہ بھی عیسائی تھا، کاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسی سے فرامینِ سلطنت کی مراسلت متعلق تھی اور بقول علامہ شبلیؒ وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، عباسی دور میں ابواسحاق صابی اس منصب پر فائز تھا، سلطنت دیلم کے تاجدار عضد الدولہ جیسے عظیم فرمانروا کا وزیر اعظم بھی ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام فرمانروا نہ صرف اپنی طاقت وحکمرانی میں ممتاز تھے؛ بلکہ مذہب سے بھی ان کا خاص تعلق تھا؛ لیکن ان کی مذہبیت غیر مسلم بھائیوں سے سلطنت کے اہم اور کلیدی شعبوں میں خدمت لینے میں حارج نہیں ہوئی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: مقالاتِ شبلی: ۲/۲۱۷-۲۱۹)

معاشی تعلقات میں اضافہ خاص کر غیر مسلم اکثریت کے ساتھ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مفاد میں ہے اور تعلقات ہمیشہ دوطرفہ بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں، اگر مسلمان غیر مسلم تاجروں اور کاروباریوں سے تعلقات رکھنے اور کاروبار کرنے میں گریز سے کام لیں تو اس سے اکثریتی فرقہ میں بھی تعصب کے جذبات پروان چڑھیں گے اور انجام کار یہ چیز خود مسلمانوں کے حق میں نقصاندہ ہوگی، اس لئے ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ایسا ماحول پیدا نہ ہو، اس کی نظیر خود حیات طیبہ میں موجود ہے کہ مشرکین مکہ نے تو مسلمانوں کا معاشی اور سماجی بائیکاٹ کیا؛ لیکن مسلمانوں نے اہل مکہ کا بائیکاٹ نہیں کیا اور بعض ایسے علاقے جہاں سے مکہ کی تجارتی رسد روکی جاسکتی تھی کو بھی روکا نہیں گیا، اسی طرح مدینہ میں یہودی قبائل کے اچھے خاصے مارکٹ موجود تھے اور مسلمان بھی بلا امتیاز وہاں سے مال خریدتے تھے اور ان سے کاروباری تعلق رکھتے تھے۔

سیاسی تعلقات

حضرات! انسان جس خطہ میں رہتا ہو، وہاں کے سیاسی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا، کیوں کہ سیاسی مدوجزر اور اتار چڑھاؤ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور بڑی حد تک سماج کا امن و امان بھی ان حالات سے متعلق ہوتا ہے؛ چنانچہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے، سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم بنانا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت موجود نہیں تھی؛ البتہ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔

سیاسی اشتراک

اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک بیرونی شخص کا حق ادا کرنے سے انکار کردیا، چوں کہ اُس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے ہم قبیلہ لوگ بھی نہیں تھے، اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ بزورِ طاقت اپنا حق حاصل کرسکے، اس غریب الوطن شخص نے صحن کعبہ میں اہل مکہ کو اپنی بپتا سنائی اور ان کے ضمیر سے انصاف کے طلب گار ہوئے، اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک نشست ہوئی، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پوری سرگرمی سے شرکت کی اور اس طرح ''حلف الفضول'' نامی ایک تنظیم قائم ہوئی، جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کام اس قدر پسند تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا: ''**لَوْ أُدْعٰی بِهٖ فِيْ الإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ**''۔ (البدایة والنهایة: ۲/۲۹۱)

بنواُمیہ کے دور میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے

درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی ،جس میں ولید کی زیادتی تھی ،حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں اسی حوالہ سے لوگوں کی مدد چاہی ، یکے بعد دیگرے کئی صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس پر لبیک کہا، بالآخر ولید کواپنے ارادہ سے باز آنا پڑا، (سیرت ابن ھشام:۱/۱۳۵)
یہ واقعہ اس بات کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کرسکتے ہیں اور سیاسی تعلقات میں اصولوں کی بنیاد پر غیرمسلموں کا تعاون کیا جاسکتا اوران سے تعاون لیا جاسکتا ہے، نیز ایسی سیاسی تنظیموں میں جوخالص مسلم تنظیم نہ ہو،مسلمان شریک ہوسکتے ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے،مصر میں اس وقت مشرکین ہی کی حکومت تھی ،حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی مفادات اورمصالح کو سامنے رکھتے ہوئے وزارتِ خزانہ طلب فرمائی ،''قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ'' (یوسف:۵۵)حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش قبول کی گئی اورانھوں نے اس فریضہ کو بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک وسہیم ہونا بھی درست ہے،جس میں غیرمسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

مبنی برانصاف قوانین کی اطاعت

غیرمسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات دو اصولوں پر مبنی ہوں گے ، اوّل ان قوانین کی اطاعت پر ،جو مبنی برانصاف ہوں ؛ کیوں کہ آپ جب کسی ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں ،تو یہ زبانِ حال سے اس ملک کے دستور کی پاسداری اورفرمانبرداری کا اقرار ہے اورایک طرح کا عہد ہے، جو ہم نے اس ملک کے ساتھ کیا ہے اوراللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو:''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (المائدۃ:۱) ایک اورموقع پر فرمایا گیا:''اَوْفُوْا بِالْعَھْدِ'' (الاسراء:۳۴) یعنی معاہدات اوروعدوں کی پاسداری کرو، قانون شکنی کواسلام جائز نہیں قرار دیتا؛ بشرطیکہ وہ صریحاً عدل کے خلاف نہ ہوں۔

یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اسلام میں معاہدات کو ایسی اہمیت حاصل ہے کہ ان کی وجہ سے بعض عمومی قوانین میں استثنائی صورت اختیار کی جاتی ہے؛ چنانچہ قرآن مجید کا یہ ارشاد قابل توجہ ہے :

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ، وَالَّذِيْنَ آوَوْا وَّنَصَرُوْا أُوْلٰئِکَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ، وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَالَكُمْ مِّنْ وَّلاَ يَتِهِمْ مِّنْ شَيْئٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ، وَإِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاق۔ (الانفال:۷۲)

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی ، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں ، رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آنہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں ، ہاں اگر وہ دین کے معاملہ تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے ؛ لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم اکثریت کے ساتھ زندگی گزارنے والے مسلمانوں کی مدد کے بارے میں فرمایا ہے کہ بشرطیکہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان پہلے سے کوئی معاہدہ موجود نہ ہو، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں ،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''مسلمانوں کی شان یہ ہے کہ وہ دوسرے مسلمان پر ظلم بھی نہ کرے اور اسے ظلم ہوتا ہوا چھوڑے بھی نہیں'' — لیکن صلح حدیبیہ کے موقع سے جب حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ پا بہ زنجیر خون میں لہولہان ہوکر آئے اور مسلمانوں سے التجاء کی کہ وہ انھیں اپنے ساتھ مدینہ لے چلیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش بلکہ اپیل کے باوجود اہل مکہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے تو آپ نے انھیں ساتھ لینے پر اصرار نہیں فرمایا اور تلقین کی کہ صبر کرو ، اللہ تمہارے لئے کوئی راستہ نکالیں گے ،غرض کہ حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کی گزارش اور اس آزمائش کے مقابلہ آپ نے طے شدہ معاہدہ پر عمل کرنے کو ترجیح دی۔

اسی طرح غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے پاس فوجیوں کی تعداد کم تھی اور ایک ایک فوجی کی اہمیت تھی ،اسی درمیان حضرت حذیفہ بن یمان اور ان کے والد اہل مکہ کی فوج کی جانب سے آئے ،اہل مکہ نے انھیں گرفتار کرلیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ وہ جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ شریک نہ ہوں ، پھر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جہاد میں شرکت کے لئے اجازت کے خواستگار ہوئے ؛لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ کہہ کر شریک جہاد ہونے سے منع فرمایا کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو، اللہ ہماری مدد کرے گا — اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غیرمسلموں کے ساتھ طے پانے والے معاہدات کی کسی قدر اہمیت ہے!

غرض کہ جب ہم کسی ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں تو یہ اس ملک کے قوانین کی پابندی کا عہد ہوتا ہے اور دستور کی وساطت سے ہم صرف حکومت ہی کے ساتھ نہیں ؛ بلکہ ملک کے تمام شہریوں کے ساتھ بھی ایک معاہدہ میں بندھے ہوتے ہیں ،اس لئے ہم پر ملکی قانون کا پاس ولحاظ رکھنا نہ صرف قانوناً واجب ہے ؛ بلکہ شرعاً بھی واجب ہے ، بشرطیکہ وہ

صریح طور پر اسلامی شریعت سے متصادم نہ ہو۔

ظلم کی مخالفت

سیاسی اشتراک کی دوسری بنیاد ظلم کی مخالفت اور اس کے سدِّ باب میں باہمی تعاون ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مُنکَر کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے، ''مُنکَر'' میں تمام برائیاں شامل ہیں اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منکر کو روکنے کے طریقہ کے سلسلہ میں یہ اصول بتایا کہ اس کے لئے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے طاقت کا استعمال کرسکتا ہو تو اس کا استعمال کرے، اگر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرے اور اگر زبان کے استعمال سے بھی عاجز ہے تو دل سے اس کو برا مانے اور عزم رکھے کہ جب بھی ممکن ہوگا، وہ ظلم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا۔

مَنْ رَأیٰ مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیَغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ ، وَ مَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ ، وَ مَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ ، وَ ذٰلِکَ أَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔ (مسلم، حدیث نمبر:۴۹)

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ بزورِ بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے، اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

''ید'' ایک علامتی لفظ ہے اور ہاتھ سے مراد طاقت ہے، اس زمانہ میں ووٹ اور پُرامن احتجاج بھی ایک طاقت ہے، اسی طرح زبان سے منکر کو روکنے میں زبان کے ذریعہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی شامل ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے بری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے کو منع کیا ہے، لیکن ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت دی ہے :

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْئِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۔

(النساء: ۱۴۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ وہ مظلوم ہو۔

حدیث میں احتجاج کے بعض اور طریقے بھی منقول ہیں۔

(مجمع الزوائد: ۸/۱۲۰، باب ماجاء فی أذی الجاری)

غرض کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اشتراک درست ہے؛ البتہ سیاسی اشتراک خود مسلمانوں کا باہمی طور پر ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہو، اس کا مقصد صرف اقتدار میں ساجھے داری نہ ہو؛ بلکہ انصاف کو قائم کرنا اور ظلم کو روکنا بھی ہو۔

مذہبی تعلقات

سامعین کرام! مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں سب سے اہم موضوع مذہبی تعلقات کا ہے، اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، اپنے دین پر استقامت اور دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام، ان میں سے پہلے نکتہ یعنی دین پر استقامت کے سلسلہ میں گفتگو ہو چکی ہے۔

دوسرے مذاہب کا احترام اور عدم مداخلت

مذہبی تعلقات کی دوسری بنیاد دوسرے مذاہب کا احترام اور ان کے مذہبی امور میں عدمِ مداخلت ہے، قرآنی تعلیمات کا نچوڑ عقیدۂ توحید کی دعوت ہے، اسلام میں توحید سے زیادہ کوئی چیز مطلوب ومحمود نہیں اور شرک سے زیادہ کوئی چیز قابل ترک اور مذموم نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے حد درجہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہے اور کسی مذہب کے قبول کرنے کے لئے جبر

وتشدد جائز نہیں :

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ قَدۡ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ ۔ (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہوچکی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا :

اَفَاَنۡتَ تُكۡرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ۔ (یونس:۹۹)

کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کردیں گے کہ وہ ایمان لائیں؟

عقیدہ کے علاوہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے،قرآن مجید نے صاف طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا : " لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ "(الکافرون : ۶) "تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رَواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رُخ کرکے مسجدِ نبوی میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی،(احکام الذمۃ:۱/۳۱۶)فقہاء نے لکھا ہے کہ :

اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہے۔(احکام أھل الذمۃ:۱/۳۱۶)

اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے، یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔(حوالہ سابق)

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے ؛

حالاں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے؛ لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ۔ (الانعام:۱۰۸)

وہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

عبادت گاہوں کا احترام

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملہ میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج:۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں خواہ کسی مذہب کی ہوں، ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی امور میں کوئی مداخلت کی جائے گی، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۰۴۱) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (موسوعۃ الخراج:۱۴۳)

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازیٔ تحریر کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیرمسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور رَوادار بھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہ در تہ دبیز پردے ڈال دیے گئے ہیں، مذہبی معاملات کے سلسلہ میں یہ اُصول

غیر مسلم اکثریت کے ساتھ بھی اسی طرح قابل عمل ہیں، جیسے غیر مسلم اقلیت کے ساتھ۔

حضرات! یہ تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے روابط کے بارے میں بعض تفصیلات تھیں ؛ لیکن اس موقع سے میڈیا کے پروپیگنڈہ کی وجہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط میں پیدا ہونے والی کرواہٹوں کی نسبت سے دو غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ضروری محسوس ہوتا ہے۔

جہاد — حقیقت اور غلط فہمی

اول یہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے موضوع پر شکوک وشبہات کے کانٹے آج کل جس عنوان سے بوئے جاتے ہیں، وہ ہے جہاد، جہاد کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان تلوار تھامے گھر سے نکلتا ہے اور جس غیر مسلم کو پاتا ہے اسے تہِ تیغ کر دیتا ہے، اسی لئے آج کل دہشت گردی اور جہاد کو ہم معنی الفاظ سمجھ لیا گیا ہے؛ حالاں کہ جہاد ایک قانونی عمل ہے اور دہشت گردی غیر قانونی فعل۔

جہاد تمام غیر مسلموں سے نہیں ہے؛ بلکہ ان غیر مسلموں سے ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔ (البقرۃ:۱۹۱)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اس آیت میں ''حد سے تجاوز کرنے'' کو منع کیا گیا ہے، حد سے تجاوز کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اوّل یہ کہ جو لوگ تم سے برسر پیکار نہ ہوں، تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، دوسرے یہ کہ جب جنگ ہو تو انسانی تقاضوں اور جنگ کے مہذب قوانین کو ملحوظ رکھو،

عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں، نیز جنگ میں حصہ نہ لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین نے جنگ میں ان لوگوں کو نشانہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر ۲۱۶۴)

ایک اور موقع پر قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن سے جہاد کا حکم ہے، کہا ہے:

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللہِ۔ (محمد:۱)

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض کفر کی وجہ سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ کفر کے ساتھ ساتھ ان کی ظلم وزیادتی اور جبر واستبداد کے سبب جہاد کا حکم فرمایا گیا، قرآن نے اس مضمون کو ایک سے زیادہ مواقع پر بہت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم حضرات مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں اور صلح جو ہوں، مسلمانوں کو بھی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہئے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلاً۔ (النساء:۹۰)

اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، پس تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کی پیش کش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا۔ (الأنفال:۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

ان آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ جنگ، جنگجوؤں اور شدت پسندوں سے ہے، نہ کہ صلح جوؤں اور امن پسندوں سے؛ بلکہ اگر کسی غیر مسلم گروہ سے امن کا

معاہدہ ہواور وہ کسی مسلمان گروہ کے درپئے آزار ہوں، تو سیاسی طور پر اور پر امن طریقوں سے تو مسلمانوں کی مدد کی جائے گی اور سیاسی واخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا؛ لیکن ان کے خلاف قتال کرنا اور عہد کو توڑ دینا پھر بھی درست نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ صراحت گذر چکی ہے :

وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيْثَاقٌ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْرٌ۔
(الانفال:۷۲)

اور اگر وہ (مسلمان) تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طلب گار ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے؛ لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہے ہیں۔

قرآن مجید کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جہاد کا حکم کن لوگوں سے ہے؟ صرف ان لوگوں سے، جو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے ہوں، جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدۂ امن ہو یا جو لوگ غیر جانبدار ہوں، نہ ان سے جنگ ہو اور نہ ان سے کوئی معاہدہ ہو، ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا، اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ انصاف کے عمومی اُصول اور تقاضے کے عین مطابق ہے کہ ظالموں کا پنجہ تھاما جائے اور انھیں ظلم سے باز رکھا جائے ، جو لوگ مسلمانوں سے جنگ نہ کرتے ہوں اور انھیں مشرکین مکہ کی طرح وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور نہ کر رہے ہوں، ان کے ساتھ جنگ کی بجائے حسن سلوک اور صلح وآشتی کا حکم دیا گیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

لاَ يَنْهٰكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (الممتحنة:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے ہیں اور تم کو
تمہارے گھروں سے نہیں نکال رہے ہیں ، اللہ تعالیٰ تم کو ان
کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتے ،
بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے کل بیاسی (۸۲) واقعات پیش آئے ہیں اور زیادہ تر جنگیں مدینہ کے قریب ہوئی ہیں ، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مسلمان حملہ آور نہیں تھے ، ان بیاسی واقعات میں کل ۱۰۱۸/ افراد دونوں طرف سے کام آئے اور اوسطاً ایک جنگ میں گیارہ جانیں گئیں ، یہی وہ تعداد ہے، جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے ، جب کہ مہا بھارت کی ''مقدس جنگ'' میں لاکھوں افراد خود ہندو مذہبی مآخذ کے مطابق مارے گئے اور عیسائی مذہبی عدالت کے حکم پر ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی اور ان میں ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی ، جن کو زندہ جلا دیا گیا ؛ لیکن افسوس کہ مغربی اقوام —— جن کی پوری تاریخ غارت گری ، خوں آشامی اور استعماریت کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے ، —— نے ''چور مچائے شور'' کے مصداق بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ پر لکھ دیا :

بوئے خوں آتی ہے ، اس قوم کے افسانوں سے

غیر مسلموں سے دوستی

دوسری غلط فہمی جو اس وقت عالمی سطح پر پائی جاتی ہے ، یہ ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کو دوست بنانے سے منع کیا ہے ؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الْكَافِرِيْنَ أَوْلِيَآئَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ، أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تَجْعَلُوْا اللهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَاناً مُّبِيْنًا۔

(النساء:۱۴۴)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو؟

اس سلسلہ میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس سے وہ مشرکین مراد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں سے آمادۂ پیکار تھے یا قیامت تک آنے والے تمام غیر مسلم اس میں شامل ہیں؟ قرآن کی تعبیر اور آیت کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عہد نبوی کے وہ غیر مسلم مراد ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ نہایت ظالمانہ رویہ روا رکھے ہوئے تھے؛ اس لئے کہ ایک تو قرآن نے اکثر ''کافرین'' کے لفظ سے ''مشرکین مکہ'' کو مراد لیا ہے، دوسرے: خود قرآن مجید میں دوسرے مقام پر اس بات کی صراحت آ گئی ہے کہ ان لوگوں کی دوستی منع ہے، جنھوں نے مسلمانوں سے جنگ کی، ان کو ان کے وطن سے نکالا اور ان کے بے وطن کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی؛ چنانچہ ارشاد ہے :

اِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَأَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ۔

(الممتحنة: ۸-۹)

وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے، ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی

ظالم ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں عہد نبوی کے ان مشرکین کی دوستی سے منع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ انتہائی درجہ معاندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے اور آج بھی جو لوگ اس طرح کا رویہ اختیار کریں ان کے لئے یقیناً یہی حکم ہوگا، عام غیر مسلموں کے لئے یہ حکم نہیں ہے، خود اس آیت میں غور کیجئے کہ اس میں ''مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ'' کے الفاظ موجود ہیں، یعنی غیر مسلموں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اور ان کو چھوڑ کر دوست نہ بنالو۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اولیاء بنانے سے کیا مراد ہے؟ عام دوست کو ولی نہیں کہتے ہیں، ولی ایسے قریب ترین شخص کو کہا جاتا ہے جس سے بے حد قربت ہو، یہاں تک کہ کوئی راز اس سے راز نہ رہے، اس لئے والد، دادا اور سرپرست کو ''ولی'' کہتے ہیں، پس آیت کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کا راز ان غیر مسلموں کے پاس نہ چلا جائے جو تم سے برسرِ پیکار ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ ہر ملک اپنے راز کی باتوں کو چھپانا چاہتا ہے؛ تاکہ دشمن اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکے، عام دوستانہ تعلقات اس میں مراد نہیں ہیں۔

اس پر ایک اور طرح سے غور کیا جاسکتا ہے کہ شریعت اسلامی میں مسلمانوں کو یہودی اور عیسائی عورت سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے، اس لئے مسلم سماج میں غیر مسلم ماں اور غیر مسلم بیوی کا وجود ہوسکتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ تمام رشتوں میں سب سے زیادہ محبت کا رشتہ ماں اور بیوی کا ہوتا ہے، تو اگر غیر مسلموں سے محبت اور دوستی کی مطلقاً ممانعت ہوتی تو ان سے اس طرح کا رشتہ کیسے جائز ہوتا؟ غرض کہ غیر مسلموں کو دوست بنانے کی ممانعت کا تعلق ان غیر مسلموں سے ہے، جو صرف مذہبی اعتبار سے مسلمانوں سے اختلاف ہی نہ رکھیں؛ بلکہ ان کا سلوک بھی معاندانہ ہو، نیز دوستی سے مراد ایسی دوستی ہے جو مسلم مملکت کے محفوظ راز کے افشاء ہوجانے کا سبب بن سکتا ہو، یا بعض مفسرین کے اقوال

کے مطابق دوسرے اہل مذاہب سے مذہبی اثرات اور طور وطریق کو قبول کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہو، عام دوستی، محبت اور تعلق جو سماج کے ایک شخص کی دوسرے شخص سے ہوتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

حضرات! اخیر میں یہ بات عرض کرنی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان —— خواہ مسلمان اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں —— تمام روابط اور تعلقات کی اساس یہ ہے کہ مسلمان داعی ہیں اور غیر مسلم مدعو، مسلمان خیر اُمت ہیں اور غیر مسلم ان کی تبلیغی کوششوں کا میدان، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آلِ عمران:۱۱۰)

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو۔

یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ بقول حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ: ''جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اُمت کی طرف مبعوث ہیں، اسی طرح یہ اُمت پوری انسانیت کی طرف مبعوث ہے'' جو ان کو بھلائی کی دعوت دینے اور برائی سے روکنے پر مامور ہے اور سب سے بڑی بھلائی ایمان اور سب سے بڑی برائی کفر ہے؛ لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ایمان کی دعوت اور کفر سے ان کو بچانے کی کوشش یقیناً داخل ہے، اس لئے جو اوصاف بحیثیت داعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کئے گئے ہیں اور جو سلوک آپ نے اپنے زمانہ کی غیر مسلم اکثریت کے ساتھ اختیار کیا تھا، وہی اس اُمت سے بھی مطلوب ہے، قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلوک کو اس طرح بیان کیا ہے :

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ، وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ

لاَ انْفَضُّوا مِنْ حَوْلِکَ۔(آلِ عمران:۱۵۹)

(اے پیغمبر!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے ئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش چھٹ جاتے۔

یعنی آپ اپنے مخاطب کے لئے نرم گفتاری اور نرم خوئی اختیار فرمایا کرتے تھے، یہی چیز ہے، جو آپ کے جانی دشمنوں کو بھی آپ کے جانثاروں میں داخل کردیتی تھی، قرآن مجید نے خاص طور پر مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ لوگوں سے بہتر طور پر گفتگو کرو: ''قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنا''۔(البقرہ:۸۳)

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

خالق الناس بخلق حسن۔

(بخاری، کتاب الایمان، باب حلاوۃ الایمان)

لوگوں کے ساتھ بہتر اخلاق سے پیش آؤ۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو جب فرعون کو دعوت دینے پر مامور کیا گیا تو بطور خاص تاکید کی گئی :

فَقُوْلاَ لَهُ قَوْلاً لَّيِّناً۔(طٰہٰ:۴۴)

فرعون سے نرم گفتگو کرنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے ماں باپ اپنی اولاد سے یکطرفہ لطف ومحبت اور حسن سلوک کرتے ہیں، اسی طرح داعی گروہ کے لئے ضروری ہے کہ مدعو کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی درجہ محبت اور حسن سلوک پر مبنی ہو اور وہ اپنی طرف سے تعلقات کو خوشگوار اور معتدل رکھنے کی پوری کوشش کرے، یہاں تک کہ مدعو کی زیادتی بھی ان کو عدل اور اعتدال کے راستہ سے ہٹنے نہیں دے :

لاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلاَّ تَعْدِلُوْا۔(المائدۃ:۸)

کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر
جاؤ اور عدل کرو۔

یہ بات لمحۂ فکر یہ ہے کہ ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے مسلمان مسلسل ابتلاء و آزمائش سے گذر رہے ہیں اور بہ ظاہر ظلم و جور کی داستان دراز سے دراز تر ہوتی جارہی ہے، اس کے باوجود مسلمان اللہ کی نصرت سے محروم ہیں اور ان کی بدعائیں بھی اثر سے خالی ہیں، شاید یہ قرآن مجید کے اس ارشاد کے مطابق ہے کہ جو لوگ دین حق سے بے خبر ہوں اور جن تک خدا کا پیغام پہنچا یا نہیں گیا ہو، ان پر اللہ کا عذاب نہیں آتا؛ کیوں کہ یہ ظلم ہے :

ذٰلِکَ أَنْ لَّمْ یَکُنْ رَّبُّکَ مُهْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا غَافِلُوْنَ۔(الانعام:۱۳۱)

یہ شہادت ان سے اس لئے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہوجائے کہ
تمہارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جب کہ
ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں۔

اسی طرح ایک اور موقع پر فرمایا گیا :

وَمَا کَانَ رَبُّکَ مُهْلِکَ الْقُرٰی حَتّٰی یَبْعَثَ فِیْ أُمِّهَا رَسُوْلاً یَّتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیَاتِنَا ، وَمَا کُنَّا مُهْلِکِی الْقُرٰی اِلاَّ وَأَهْلُهَا ظَالِمُوْنَ۔(القصص:۵۹)

اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا، جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے، جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہوجاتے۔

موجودہ حالات میں اور بالخصوص ہندوستان میں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم برادرانِ وطن سے جہاں تک ممکن ہو اپنے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی کوشش کریں، اسوۂ

نبوی کو سامنے رکھیں اور اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ ہم ایک داعی اُمت ہیں اور برادران وطن ہمارے مدعو ہیں، خاص کر ہندوستان کے برادرانِ وطن کے بارے میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہندو قوم خدا سے محبت رکھتی ہے؛ لیکن خدا کی معرفت سے محروم ہے، اس کے دل میں مذہب کی عظمت ہے؛ لیکن وہ دین حق کی پہچان سے محروم ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم ان کے ساتھ باہمی روابط میں اس پہلو کو ضرور ملحوظ رکھیں اور ان روابط کو دعوت دین کے لئے استعمال کریں، تبھی ایک باعزت اُمت کی حیثیت سے ہم سربلندی کی زندگی گزار سکیں گے۔

اخیر میں مجلس تعمیر ملت کے صدر عالی قدر محترم جناب عبد الرحیم قریشی صاحب، نائب صدر مولانا سلیمان سکندر صاحب اور اس پروگرام کے کنو ینر محبی فی اللہ جناب ضیاء الدین نیر صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس اہم خطبہ کے لئے اس حقیر کو مدعو کیا اور آپ حضرت سے کچھ عرض کرنے کا موقع عنایت فرمایا، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور ہم سب کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ ہمارا جینا اور مرنا اور نرم وگرم ہونا اللہ کے لئے ہو۔

ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للّٰہ رب العالمین،

و السلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ و بر کاتہ۔

○○○